جناب حسن احمد مینائی

# امیر مینائی

منشی امیر احمد امیر مینائی عام طور پر صرف شاعری حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ گو اس جامع الکمال ہستی کو قدرت نے ایسی صلاحیتیں اور متعدد علوم و فنون میں ایسی دستگاہ عطا کی تھی کہ وہ اُن میں سے ہر ایک میں شہرت حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن قسام ازل کا منشا یہ تھا کہ امیر شاعری کی بدولت زیادہ شہرت پائیں۔ امیر کی باکمال زندگی کے مختلف پہلوؤں میں شاعری کے پہلو کے زیادہ نمایاں اور روشن ہونے کی بڑی وجہ اس زمانے کا ماحول تھا جس میں امیر جیسے اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان نے ادبی زندگی میں قدم رکھا۔ گزشتہ صدی ہجری کا وسط وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی فضا شعر و سخن کے چرچوں سے معمور تھی۔ اُردو ادب کے اس دور میں ناسخ و آتش اپنی شاعری کا لوہا منوا چکے تھے۔ انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے اور امیر و وزیر جیسے اُستادانِ فن نے اپنے کمالات سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر رکھی تھی۔

## حالات

امیر احمد مینائی بتاریخ ۱۶ر شعبان ۱۲۴۴ھ (۲۱ر فروری ۱۸۲۹ء) بروز دوشنبہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ماجد شیخ کرم محمد مینائی خاندانی روایات کے مطابق ایک عالمِ باعمل اور فاضلِ اجل تھے اور درس و تدریس اُن کا مشغلہ تھا۔ مینائی خاندان کے افراد اپنی لیاقتِ علمی اور تقویٰ و پرہیزگاری کے سبب محتاجِ تعارف نہیں تھے۔ تشنگانِ علم دُور دُور سے آتے اور اس خاندان کے فیض سے سیراب ہوتے۔ امیر مینائی کی تعلیم و تربیت کا بھی شروع ہی سے بہت زیادہ اہتمام کیا گیا۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ علمِ دین کی تعلیم سے ان کی تربیت کا آغاز ہوا۔ امیر نے پڑھنے لکھنے میں غیر معمولی انہماک اور اعلیٰ ذہانت کا ثبوت دیا۔ نو سال کا سن تھا کہ انھوں نے شعر موزوں کرنے بھی شروع کر دیے۔ والد ماجد کو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے ہونہار فرزند کو تحصیل و تکمیل علوم کی طرف توجہ کرنے کی نصیحت کی اور سمجھایا کہ ابھی شعر و شاعری کا وقت نہیں، علم حاصل کرو۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک امیر نے علومِ مروّجہ کی تمام ابتدائی کتابوں کی تکمیل کر لی جس کے بعد ضرورت اس کی

ہوئی کہ وہ علما اور فضلائے وقت کے سامنے زانوے ادب تہہ کریں۔ چنانچہ امیرؔ سولھویں برس مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی سے منطق و فلسفہ اور مولوی تراب علی لکھنوی سے علم ادب پڑھنے لگے۔ پھر مفتی محمد یوسف، مولوی عبدالحکیم فرنگی محلی اور حضرت مولینا عبدالحق خیرآبادیؒ سے فقہ اور معقولات وغیرہ کی تکمیل کی۔ اور شیخ حسن علی محدّث سے علم حدیث حاصل کیا۔ اس طرح چوبیس پچیس سال کی عمر تک امیر اپنی لیاقت علمی کی بنا پر لکھنؤ بھر میں مشہور ہوگئے اور عوام و خواص علمی مسائل کی تحقیق کے لیے ان سے رجوع کرنے لگے۔ امیر مینائی نے علم طب نواب محمد حسن خان صاحب بریلوی سے سیکھا اور بعض بڑے کامیاب علاج کیے۔ علم جفر کا مطالعہ کرکے اس میں بھی حیرت انگیز دستگاہ حاصل کی، اور اس سے متعلق دو کتابیں "رمزالغیب" اور "رموزِ غیبیہ" تصنیف کیں۔ یہ کتابیں جن کے قلمی نسخے کتب خانۂ رامپور میں موجود ہیں، طبع نہیں ہوئیں مستحصلہ یعنی علم جفر کے ذریعے ملنے والا جواب غیر مربوط حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں کسی بامعنی جملے کی شکل میں ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حرف زیادہ ہوں تو یہ کام بڑا پیچیدہ ہوتا ہے لیکن امیر کی طبیعت اس میں بڑی راہ دیتی تھی۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ چھوڑنے کے بعد امیر مینائی نے جب رامپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی تو نواب یوسف علی خان کی خدمت میں اپنے استاد حضرت اسیرؔ لکھنوی کے بارے میں ایسی تحریک کی کہ نواب صاحب نے اُنھیں بھی رامپور طلب کیا۔ اس طرح دربارِ رامپور سے اسیرؔ کا تعلق ہوگیا گو انھوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار نہیں کی۔ وہ لکھنؤ سے رامپور آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت اسیرؔ ایسے وقت میں رامپور میں تھے کہ لکھنؤ میں وبا پھیلی ہوئی تھی اور گھر سے کئی روز سے خط نہیں آیا تھا۔ فکرمندی میں اُنھوں نے امیرؔ سے کہا کہ وہ جفر کے ذریعے معلوم کریں کہ گھر پر کیا حال ہے اور خط کب آئے گا۔ جواب میں جو مستحصلہ نکلا اس کے حرفوں کی نوعیت الجھن میں ڈالنے والی تھی لیکن امیرؔ نے انھیں یوں ترتیب دیا "دوشنبہ خطِ خیریت آید مع قدرے از آہن"۔ اس پر سب کو بہت تعجب ہوا کہ خط میں لوہے کا کیا کام اور خط کے ساتھ لوہا کیسے آئے گا۔ غرض اگلے دوشنبہ کی صبح کو (جس میں دو ہی ایک دن باقی تھے) اسیرؔ مرحوم کے خلفِ اکبر حکیمؔ مرحوم کا خط آیا۔ خیریت لکھی تھی لیکن خط میں ایک سوئی بھی نکلی۔ لوہا تو سب مان گئے لیکن یہ معمّہ اس وقت سمجھ میں نہیں آیا کہ خط میں سوئی کیوں آئی۔ اسیرؔ مرحوم نے لکھ کر دریافت کیا تو جواب آیا کہ "سوئی قصداً خط میں نہیں رکھی گئی تھی، غلطی سے ملفوف ہوگئی ہوگی۔"

فطری صلاحیت و استعداد کی بنا پر چونکہ امیرؔ نے شعر کہنا نو سال ہی کی عمر سے شروع کر دیا تھا اس لیے تحصیل علم کے ساتھ یہ مشق بھی جاری رہی۔ بیس بائیس برس کی عمر سے مشاعروں میں شرکت شروع کر دی تھی۔ کچھ ہی دن میں امیرؔ علاوہ عالم و فاضل کے شاعر بھی مشہور ہو گئے۔ شاعری میں انھوں نے اسیرؔ سے جو اُن کے والد کے شاگرد تھے، تلمذ اختیار کیا۔ منشی مظفر علی اسیرؔ دربار اودھ میں عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ اور نواب واجد علی شاہ کے معتمد خاص تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے کچھ عرصے بعد انھیں دربار میں پیش کر دیا۔ اس وقت امیرؔ کا سن پچیس سال کا تھا۔ اسی سلسلے سے امیرؔ مینائی عدالتِ دیوانی کے حاکم مقرر ہوئے اب اُن کی زندگی منظم ہو چکی تھی۔ چنانچہ قدرتی طور پر مشغلہ شعر و سخن میں ترقی ہوتی گئی۔ اس زمانے میں بھی امیرؔ نے تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رکھا۔ سنسکرت جو ابتدا میں تھوڑی پڑھی تھی اس میں مہارت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حالات اگر سازگار رہتے تو باکمالوں کو اپنے جوہر دکھانے اور قوم کے علمی اور ادبی خزانوں میں بیش بہا اضافے کرنے کا خوب موقعہ ملتا۔ لیکن ایک طرف تو عوام کو بے جا تن آسانیوں نے ناعاقبت اندیش بنا دیا تھا اور دوسری طرف شاہِ اودھ کی کمزوریوں نے اغیار کو اچھا عذر دے دیا اور بنگال کے بعد اودھ بھی سلطنت انگلشیہ میں شامل کر لیا گیا۔

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے ہنگامے نے شمالی ہند کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ لکھنؤ کے اجڑ جانے پر وہاں کے اکثر و بیشتر معزز افراد کے لیے حالات بہت ناسازگار ہو گئے۔ امیرؔ مینائی کوئی سال بھر تک قصبہ کاکوری میں مقیم رہے۔ پھر نواب رامپور یوسف علی خان نے ان کو اس تعلق سے رامپور طلب کر لیا کہ امیرؔ کے والد نواب کے استاد رہ چکے تھے۔ یوسف علی خان کے والد نواب محمد سعید خان ایک زمانے میں عرصے تک لکھنؤ میں رہے تھے۔ اُن کے ساتھ یوسف علی خان بھی تھے۔ جنھیں کتب درسیہ کی تعلیم مولوی کرم محمد صاحب مینائی نے دی تھی۔ نواب صاحب نے امیرؔ مینائی کو ان کی خاندانی علمیت و وجاہت کے پیشِ نظر مفتی عدالت کے معزز عہدے پر مامور کیا اور مقربینِ خاص میں شامل کر لیا۔ نواب یوسف علی خان ایک خوش فکر شاعر تھے اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے امیرؔ سے مشورہ سخن بھی شروع کر دیا۔ امیرؔ مینائی نے رامپور میں نواب یوسف علی خان کے بعد تین اور فرمانرواؤں یعنی نواب کلب علی خان، نواب مشتاق علی خان

اور نواب حامد علی خان کے دورِ دیکھے۔ "امیر اللغات" کے نام سے اُردو زبان کے ایک بسیط لغت کی ترتیب کا کام بڑے وسیع پیمانے پر حضرتِ امیر نے نواب کلب علی خان کے دور میں شروع کیا۔ اُن دنوں صوبجات متحدہ کے گورنر سر الیفرڈ لائل اُردو زبان کے بڑے قدردان تھے۔ انھوں نے کلب علی خاں سے اُردو کا ایک نہایت جامع اور مستند لغت تالیف کرانے کی فرمائش کی تھی۔ گو اُس زمانے میں رام پور متعدد مشاہیر کی موجودگی کی وجہ سے جن میں ادیبوں اور شعرا کے علاوہ علما و فضلا بھی شامل تھے، صاحبانِ کمال کا ایک مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن مختلف علوم کے جامع اور خصوصاً اُردو کی مانند تینوں بڑی زبانوں یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت پر یکساں عبور رکھنے کی وجہ سے یہ مشکل کام حضرت امیر ہی کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے یہ ذمہ داری بخوشی اپنے سر لے لی اور اس طرح امیر اللغات کی تالیف کی داغ بیل پڑی۔ افسوس ہے کہ کچھ عرصہ بعد حالات پھر موافق نہیں رہے۔ اور ایسی دشواریوں کا سامنا رہا کہ "امیر اللغات" کی تالیف پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ اس لغت کی ابتدائی دو جلدیں جو بالترتیب الف ممدودہ اور الف مقصورہ سے شروع ہونے والے الفاظ پر مشتمل ہیں، شائع ہو کر عوام تک پہنچ سکیں۔ اگر یہ لغت اسی شرح و بسط کے ساتھ مکمل ہو جاتا تو انیسویں صدی عیسوی کے ختم تک کی اُردو زبان کا سب سے زیادہ بسیط و مستند لغت اور اُردو زبان کی شاہراہ پر ایک نہایت نمایاں سنگِ میل ہوتا۔

امیر کی شہرت اس عرصے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ بیشتر رؤسائے ہند امیر سے نہ صرف واقف ہو چکے تھے بلکہ انھیں اپنے ہاں بلانے اور مہمان کرنے کے متمنی رہتے۔ نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال نے، جو شاعرہ تھیں اور تاجور تخلص کرتی تھیں، اپنے دیوان کا ایک نسخہ امیر کو بطورِ تحفہ روانہ کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد امیر مینائی بھوپال گئے اور وہاں تقریباً ایک ماہ تک ریاست کے مہمان خاص رہے۔ اس زمانے میں سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ میر محبوب علی خاں آصف جاہِ سادس کے عہد کی برکات سے مستفید ہو رہی تھی۔ وہ امیر کا کلام اور تصانیف بھی دیکھ چکے تھے اور اکثر جناب داغ سے امیر اور کلامِ امیر کا ذکر کرتے۔ متعدد احباب نے امیر کو اس بات سے مطلع کر دیا تھا کہ نظامِ دکن کا منشا آپ کے یہاں آنے کا ہے۔ ۱۲۱۷ھ میں میر محبوب علی خاں نے کلکتہ کا سفر کیا تھا۔ امیر کو اطلاع دی گئی کہ واپسی پر بنارس میں

قیام ہوگا۔ آپ اس موقعہ پر ملاقات کریں۔ چنانچہ امیر مینائی بنارس گئے اور باریابی حاصل کی۔ مسدس جو خدمتِ سلطانی میں پیش کرنے کے لیے نظم کیا تھا وہ کلام سنانے کی فرمائش پر نذر کیا اور دادِ سخن پائی۔ اعلیٰ حضرت کی مرضی کے مطابق ارکانِ اسٹاف نے امیر سے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا لیکن وہ اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر اُس وقت حیدر آباد نہ جا سکے۔

امیر مینائی کے خاندان کے متعدد افراد ایک عرصے سے ریاست حیدر آباد دکن میں مقیم اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے اس لیے سلطنت آصفیہ امیر مینائی یا اُن کے فرزندوں کے لیے کوئی بیگانہ مقام نہ تھا۔ ۱۳۱۸ھ میں امیر نے آخرکار حیدر آباد کے سفر کا ارادہ کر لیا اور راستے میں بھوپال اور کلبرگہ شریف میں قیام کرتے ہوئے ۰ اجمادی الاول کو حیدر آباد پہنچے۔ نام پلی اسٹیشن پر حضرت امیر کا جس قدر استقبال ہوا، اس کے چرچے لوگوں میں ایک عرصے تک رہے۔ چونکہ مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ امیر ہمیشہ کے لیے اسی سرزمین میں رہیں، اس لیے حیدر آباد پہنچنے کے دو ہی تین دن بعد اُن کی طبیعت یکایک ناساز ہو گئی۔ بیماری میں جو شروع میں خفیف تھی روز بروز پیچیدہ اور شدید ہو گئی۔ اور ۱۸ اور ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ (۱۲، ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۰ء) کی درمیانی شب کو رات کے دو بجے یہ آفتاب سخن رُوپوش ہو گیا۔ مزار احاطہ درگاہ حضرت یوسفینؒ میں واقع ہے۔ لوحِ مزار کی پشت پر صاحبِ مزار ہی کا یہ شعر دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کراتا ہے:

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

امیر مینائی نے اپنے سنہ وفات کی بابت ایک شعر میں، جو رامپور چھوڑنے سے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا، اشارہ کر دیا تھا۔ شعر ہے:

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس شعر میں لفظ "غریب الوطنی" کے عدد ۱۳۱۸ ہیں جو اُن کا ہجری سنِ وفات ہے۔

حضرت امیر مینائی کی ذات اسلامی صفات کا ایک سچا نمونہ تھی۔ عالم باعمل ہونے کی دولت آپ نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائی تھی۔ سُلوک و درویشی کے منازل طے کرنے کے لیے حضرت امیر شاہ جیسے کامل بزرگ سے ارادت کا شرف کم سنی ہی میں حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے زیر تربیت و ہدایت امیر مینائی نے مدارجِ سلوک طے کر کے خلافت نامہ بھی حاصل کیا۔ کاملوں کے

کمال کا ایک پہلو اُن کا عجز و انکسار بھی ہے حضرت امیر مینائی بہ حیثیت ایک باکمال شاعر کے جملہ اصنافِ سخن پر حاوی تھے لیکن آپ نے اس باب میں کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب کامل اُٹھ جاتے ہیں تو لوگ ناقصوں ہی کو کاملوں میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ خود مسلم الثبوت استاد تھے لیکن زبان کے ہر مسئلے کا ثبوت دوسرے اساتذہ کے کلام سے دیتے جن میں اپنے ہمعصروں کو بھی شامل کر لیتے۔

## تصانیف

امیر مینائی کی نظم و نثر کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تقریباً ۳۵ ہے۔ دواوین میں ان کے تین اُردو اور ایک فارسی دیوان موجود ہیں۔ موخر الذکر دیوان طبع نہیں ہوا۔ اردو دواوین میں ایک نعتیہ اور دو عاشقانہ دیوان ہیں۔ نعتیہ دیوان "محامد خاتم النبیین" ہے۔ اس دیوان کے ساتھ نثر کی ایک تالیف "خیابانِ آفرینش" شامل ہے جس میں سرور کائنات ؐ کی ولادتِ باسعادت سے لے کر ہجرت سے کچھ بعد تک کے اہم واقعات سے متعلق مستند روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ عاشقانہ دواوین میں پہلا "مرآۃ الغیب" اور دوسرا "صنم خانۂ عشق" ہے جس کی بابت علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبالؔ     میں بُت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

ایک ابتدائی دیوان جس کا نام غیرتِ بہارستان تھا، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ اس کے جو متفرق اشعار یاد رہ گئے وہ صنم خانۂ عشق کے آخر میں "گوہر انتخاب" اور "جوہر انتخاب" کے نام سے شامل ہیں۔ امیر مینائی نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ ان کا کلام غزلوں اور قصائد کے علاوہ رباعی، مخمس، مسدس اور ترجیع بند وغیرہ پر مشتمل ہے۔ تاریخیں بھی امیر مینائی نے معرکے کی کہی ہیں۔ دیوان "مرآۃ الغیب" کے ساتھ ان کے سات قصائد بھی شامل ہیں اور "محامد خاتم النبیین" کے شروع میں بھی نعت و منقبت کے پانچ قصیدے ہیں ان کے علاوہ متعدد قصائد غیر مطبوعہ ہیں۔ امیر مینائی کے چھ واسوختوں کا ایک مجموعہ نولکشور پریس نے شائع کیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک واسوخت غیر مطبوعہ ہے۔

نثر میں امیر مینائی کی جو چیزیں یادگار ہیں۔ اُن میں "انتخاب یادگار" کے نام سے کوئی سوا چار سو

ایسے شعرا کا تذکرہ شامل ہے جن کا تعلق ریاست رامپور سے تھا۔ "امیر اللغات" کی ترتیب کے ضمن میں امیر مینائی نے کچھ اور کتابیں بھی مرتب کی تھیں جن کے نام محاوراتِ مصادرِ اُردو، سرمۂ بصیرت، اور بہارِ ہند ہیں۔ یہ کتابیں بھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔ حضرت امیر کے ایک ممتاز شاگرد احسن اللہ خان ثاقب مرحوم نے اپنے اُستاد کے خطوط کا ایک مجموعہ "مجموعہ خطوطِ منشی امیر احمد" کے نام سے مرتب کیا جو مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اُردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔

امیر مینائی کی سوانح عمریوں میں تین تصانیف قابلِ ذکر ہیں :- (۱) "طرۂ امیر" از امیر احمد علوی (مطبوعۂ انوار المطابع لکھنو۔ ۱۹۲۸ء)۔

(۲) "سوانح امیر مینائی" مرتبۂ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل۔ (مطبوعہ سیدی پریس دار الشفا۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۳۴۷ھ)۔ (۳) "امیر مینائی" مرتبہ شاہ ممتاز علی آہ، جو امیر مینائی کے ایک اور ممتاز شاگرد تھے۔ یہ کتاب ادبی پریس لکھنو میں ۱۹۴۱ء میں طبع ہوئی۔

## نمونۂ کلام

آخر میں امیر مینائی کے کلام کا ایک مختصر انتخاب ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ امیر کے کلام کے ابتدائی دور کا نمونہ "گوہرِ انتخاب" اور "جوہرِ انتخاب" کی شکل میں محفوظ رہ گیا ہے اس میں جنگِ آزادی سے قبل کے اساتذہ کے کلام کا رنگ جھلکتا ہے۔ کچھ اشعار یہ ہیں :

دل، بوند بھر لہو ہے، پر جب یہ مضطرب ہو
اُس وقت رنگ دیکھو اس بوند بھر لہو کا

یوں ترے در پہ کیوں پڑے رہتے
ہم غریبوں کا گھر اگر ہوتا

بولے وہ سُن کے رات کو میری صدا امیر
پوچھو تو کوئی نام ہے کیا اس فقیر کا

ہے قصدِ شبِ غم میں کریں دل ہی سے باتیں
پھر کہتے ہیں دیوانے سے کیا بات کریں ہم

میں بھی اب امتحانِ یار کروں
چاہیے ضبطِ اختیار کروں

لیا پھر تو نے اُس کا نام اے دل
ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہوں

اے طُولِ زمانۂ اسیری
بُلبل کہیں گُل کو بھولتی ہے

گیا ہے دیر سے ناخوش امیر آج
خدا ہی ہے جو اب کعبے سے آئے

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی ... کاروانِ عمر گزرا، آگ باقی رہ گئی

پوچھو نہ اس زمانے میں اُلفت کا حال کچھ
اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

دیوان "مرآۃ الغیب" کے کچھ اشعار:

پہلے تو ایک صفحۂ سادہ تھا آئینہ ... دیکھا جو اُس نگار نے تصویر ہو گیا
امیرؔ اتنا ہوا ثابت کشاکش سے تنفّس کی ... مسافر کو لیے جاتا ہے کھینچے شوق منزل کا
قریب ہے یار روزِ محشر چھُپے گا کُشتوں کا خون کیونکر ... جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مشہور ہے کہ سر سیّد مرحوم کے فرزند جسٹس محمود نے، جب وہ الٰہ آباد ہائیکورٹ کے جج تھے اپنے ایک فیصلے میں مندرجۂ بالا شعر بڑے اہتمام سے نقل کیا تھا۔

خنجرِ قاتل نہ کر اتنا روانی پر گھمنڈ ... سخت کم ظرفی ہے اک دو بوند پانی پر گھمنڈ
دیکھ او ناداں کہ پیری کا زمانہ ہے قریب ... کیا لڑکپن ہے کہ کرتا ہے جوانی پر گھمنڈ
ٹھہر گیا ہے ہمارے دل میں ہزار منت سے دردِ اُلفت ... مگر یہ ڈر ہے کہ اُٹھ نہ جائے مکان کی تنگی سے تنگ ہو کر
ہم رہروانِ عشق کو محشر کا خوف کیا ... پڑتے ہیں ایسے کتنے ہی میدان راہ میں
میں تو کیا عکس سے وہ آئینہ رُو کہتا ہے ... پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو
جو چاہیے سو مانگیے اللہ سے امیرؔ ... اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال سے

دیوان "صنم خانۂ عشق" کے کچھ اشعار اور غزلوں کا انتخاب:

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا ... کہ ذرّہ ذرّہ ہے آئینہ خود نمائی کا
پہنچ کر یار تک بیخود ہوئے پہنچے نہ مطلب کو ... رسائی نے دیا کیا داغ ہم کو نارسائی کا
یہ خوبی جا بجا کر ہے جنس کی بازار ہستی میں ... فریب ان جو فروشوں سے نہ کھا گندم نمائی کا
جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا ... کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا
پھنسی جو دام میں بُلبل تو کن نگاہوں سے ... کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا
ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا ... درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا
مشربِ عشق میں کیسی ہیں یہ اُلٹی باتیں ... دل کے جانے کو یہ کیوں کہتے ہیں آنا دل کا

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

حُسن کُھلتا ہے حسینوں کا جمے جتنی نگاہ
جس قدر دیکھو اُبھرتا ہے بدن تصویر کا

دیکھ جو کچھ سامنے آ جائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر، دہن تصویر کا

ہوں وہ وحشی کھینچتا ہے جب مرا نقشہ امیر
چاک کر دیتا ہے مانی پیرہن تصویر کا

عالم میں رواج اب یہ ہوا بے ہنری کا
ہم عیب کے مانند چھپاتے ہیں ہنر آج

جو تیز رَو تھے مسافر وہ پہنچے منزل پر
میں اُٹھ کے بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

کھلے ہیں یاں دیدۂ بصیرت وہ برقِ حُسن آئے تو چمک کر
یہ دیکھنے کی نہیں ہیں آنکھیں کہ بند ہو جائیں گی جھپک کر

مرا تو کیا ذکر سائے سے بھی وہ شوخ کہتا ہے جھجک کر
یہ کیا قرینہ ہے بیٹھنے کا ادب سے بیٹھو ذرا سرک کر

بَلائیں وہ پڑ گئے اٹھا کر نقاب اپنے رُخِ حسین سے
بلائیں لیں گیسوؤں نے اتنی کہ رہ گئے دونوں ہاتھ تھک کر

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

ڈرتا ہوں جذبِ شیخ کا سُن سُن کے غلغلہ
کھچ جائے دخترِ رز نہ کہیں خانقاہ میں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیر
سَو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ وا میں

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بے خودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثلِ سرو میں دامن کشیدہ ہوں

اب تک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی
حرفِ نگفتہ ہوں سُخنِ ناشنیدہ ہوں

وہ شوخ لاکھ پردوں میں پردہ نشیں نہیں
اور پھر جو دیکھیے تو کہاں ہے کہیں نہیں

وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بے ساختہ پن کی
سنورنے سے بگڑتے ہیں، بگڑنے سے سنورتے ہیں

پردے میں تم ہو اُس پہ یہ عالم ہے حُسن کا
پردے سے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو

چتونیں کہتی ہیں کرتا ہے جو وہ وعدۂ وصل
کیا کہا، پھر تو کہہ اسے کہہ کے مُکرنے والے

دل کو اب کب قرار آتا ہے
سُن لیا ہے کہ یار آتا ہے

تم کو آتا ہے پیار پر غصّہ
مجھ کو غصّے پہ پیار آتا ہے

خُم بھی رویا مجھے پیمانہ بھی رویا مجھکو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے

کہیں زاہد کہیں کم بادۂ عرفاں کی مستی ہے
بہ قدرِ وسعتِ مشرب مقامِ مے پرستی ہے

نہ شاخِ گُل ہی اُونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمّت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

کبھی کروٹ نہیں لیتا کوئی گورِ غریباں میں
یہ کیسی نیند سوتے ہیں یہ کیسی ان کی مستی ہے

بڑھ اے آہِ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

امیرؔ اک تختۂ ہموار ہے یہ شعر کا کوچہ
طبائع کے تفاوت سے بلندی اور پستی ہے

آنکھ اُس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے
چلیئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے

ہم تم چمن میں چل کر جب چار دن رہے ہیں
بُلبل میں اور گُل میں تکرار ہو گئی ہے

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

مُنکسر وہ ہیں ہمارا گھر بنے اور ٹوٹ جائے
اُٹھتے ہی دیوار بیٹھے، دَر بنے اور ٹوٹ جائے

کشتیٔ مے جوشِ فصلِ گُل سے ہے اِس زور پہ
توبہ زاہد یہاں لنگر بنے اور ٹوٹ جائے

برہمن تجھ سے جو اُس بت کی کہوں سنگیں دلی
سنتے سنتے دل ترا پتھر بنے اور ٹوٹ جائے

آنکھ تیری آکے گردش میں جھپک جائے اگر
اک نگہ میں ساقیا ساغر بنے اور ٹوٹ جائے

ہے زمینِ سُست میں بیکار کاوش اے امیرؔ
جیسے ریگستاں میں چاہ اکثر بنے اور ٹوٹ جائے

دل اگرچہ غم سے فگار ہے مگر اِسے بھی باغ و بہار ہے
اسی شاخ کا یہ شعار ہے کہ شکستہ ہو کے ہری رہی

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سَو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

بُلاوا عرصۂ محشر میں ہے ساری خدائی کا
بڑی ہی دھوم کا جلسہ قیامت کی یہ محفل ہے

اسی جوہر سے ہے ہر دلعزیز آئینہ دنیا میں
اُسی کی شکل بن جاتا ہے یہ جس سے مقابل ہے

نعت کے چند شعر:

محمدِؐ عربی سا کوئی کہاں ہے امیرؔ
خدا کے فضل سے سرتاج ہیں رسولوں میں

نبوّت اِک بے بہا تھا گہنا کہ سلسلہ وار سب نے پہنا
تم ہی ہوئے خاتم النبیین کھلا کچھ ایسا یہ ہار تم پر

اُمّت کا مری بال نہ بیکا ہو یہ ہٹ ہے
گیسوئے سرِ دوش اس لیے بل کھاتے ہوتے ہیں

مدینے جاؤں پھر آؤں دوبارہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

اللہ کے محبوب سے ہے عشق کا دعویٰ — بندوں کا بھی کیا حوصلہ اللہ غنی ہے
میں اُس کے غلاموں میں ہوں جو سب کا ہے آقا — سردارِ رُسل سیّد مکی مدنی ہے
میری شہرت کا سبب مدحِ پیمبر ﷺ ہے امیر — ورنہ اربابِ سخن میں مرا رُتبا کیا ہے

چند فارسی اشعار:

فارغ ز انقلاب بود روزگارِ ما — یک عالم است رنگِ خزان و بہارِ ما!
دو عالم کامیابِ وصل و در فریادِ ناکامی — جو ساحل تشنہ و دریاست در آغوشِ ساحلہا
ہر کسے طالعِ بیدار ہمی خواہد و من — از خدا می طلبم لذتِ بیداریٔ دل
شبِ وصل کہ بود آں شب کہ من از خویشتن رفتم — بدیں شوخی کہ آمد در کنارِ من کہ من رفتم
نہ باشد ہمچو شمعم امتیازے در غم و شادی — بہ ہر بزمے کہ رفتم در ہوائے سوختن رفتم
مجالِ جنبشم کو از وفورِ ناتوانی ہا — بہ دوشِ بیخودی رفتم اگر از خویشتن رفتم
امیر از سوزِ عشقِ من دلِ دیگر نمی سوزد — شرارِ کاغذم بر جانِ خود آتش فگن رفتم
مرحبا اشکِ ندامت رحمتش آمد بہ جوش — بحرِ ناپیدا کنار از قطرہ پیدا کردۂ
نظر از ہر چہ آید در نظر بردار و مستی کن — کہ دارد عالم ترکِ تماشا ہم تماشائے

---

# تصوّراتِ عرب قبل اسلام

مؤلفہ: عبید اللہ قدوسی

اس کتاب میں جزیرۂ عرب قبل اسلام کی تہذیب، ثقافت، عقائد، دینی شعائر اور ان کے ذریعۂ حیات و موت کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت: ۲/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور